© rasailojaraid.com

جہاد کیا ہے؟

مارک گولڈ*

ترجمہ: عرفان محمود

عالم اسلام میں سیاسی تشدد کو اسلامی اقدار کی روشنی میں جائز سمجھنے والی تنظیموں کا وجود یہ سوال پیدا کرتا ہے: کیا اسلام اور سیاسی تشدد میں کوئی حقیقی ربط موجود ہے؟ ایک ماہر سماجیات (سوشیالوجسٹ) کا بے ساختہ جواب ''نہیں'' ہوگا۔ سیاسی تشدد کو بوقت ضرورت مباح قرار دینے کی لچک تمام ہی بڑے مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ ماہرین سماجیات ان خارجی حالات کا بھی تجزیہ کر سکتے ہیں جو سیاسی تشدد کی اتفاقی ضرورت پیدا کرتے ہیں اور تشدد کے منظم رجحانات کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔ تاہم اس صورت میں بھی میرا زاویہ نظر مختلف ہے۔ تشدد کے خارجی اور ماحولیاتی محرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے مذہبی تعلیم کو تنہا اس کا ذمے دار ٹھہرانا یقیناً حماقت ہوگی، تاہم میں یہاں اسلام کے اندر اس مذہبی استدلال پر توجہ دوں گا جو بظاہر پرتشدد رجحانات کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اسلام ایک پیچیدہ مذہبی روایت ہے اور گوں ناگوں تعبیروں کا حامل ہے۔ عمومی طور پر میرے حوالہ جات اسلام کے معروف سنی مسلک پر مبنی ہیں۔ میرا مقصد اس معروف مسلک کے ایک نقطہ نظر کو مثالی صورت کے طور پر نمایاں کرنا ہے۔ ایسے افراد موجود ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہمیں مخصوص افراد کے عقائد اور مذہبی اعمال کا جائزہ لیے بغیر عمومی طور پر اسلام یا سنی مسلک کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ تاہم یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اگر ایک طرف امت میں عقائد کی وحدت کے دعوے موجود ہیں تو دوسری جانب زمینی حقائق ان دعووں کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ جیسا کہ فریڈرک ڈینی کا کہنا ہے: ''اسلام نے دنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب کے مقابلے میں بنیادی عقائد اور اعمال کا پائیدار نظام برقرار رکھا ہوا ہے''۔ (فریڈرک ایم

---

* Mark Gould, "Understanding Jihad", *Policy Review*, Feb. March 2005, p. 15-32

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

-ڈینی، اسلام اور مسلم معاشرہ(Islam and the Muslim Community 1987)

یہاں میرا مطمع نظر اسلام میں موجود قدری وابستگیوں (Value Commitments) کی نوعیت کو واضح کرنا ہے۔ میں ان کا موازنہ عیسائیت میں پائے جانے والے غالب رجحانات سے کروں گا۔ خاص طور پر مسیحیت کے عقیدۂ نجات اور اسلام کے عقیدۂ احتساب میں موجود تضاد کا۔ عیسائیوں کے برعکس، مسلمان اپنے دامن کو کسی گناہ اوّل (Original Sin) سے داغدار کیے بغیر یقین رکھتے ہیں کہ زندگی میں خدا کی رہنمائی سے ایسے اسلوب اختیار کیے جاسکتے ہیں جو مرنے کے بعد باعث نجات ہوں۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق خدا نے انسان کو اچھے یا بُرے کاموں کو کرنے کی آزادی دی ہے، تاہم وہ انسانی اعمال کے نتائج کو پہلے سے طے کیے ہوئے ہے۔ میرا اصرار ہے کہ خدائی احکامات کی پیروی اگرچہ ممکن ہے مگر بے حد مشکل بھی ہے، اس لیے جہاد کا مذہبی فریضہ نجات کے حصول کا ایک فوری اور شارٹ کٹ راستہ بن سکتا ہے یعنی یا تو ایک انسان تمام زندگی نیک کام کرنے کی طویل مشق کرے یا پھر میدان جنگ میں شہید ہو جائے۔ پہلی صورت میں روزِ آخر احتساب کی چھلنی سے گزرنے کے بعد ہی جنت کا راستہ کھلنے کا امکان ہے، جبکہ دوسری صورت میں انسان کسی باز پرس کے بغیر سیدھا جنت میں جا پہنچتا ہے۔

پس میرے خیال میں جہاد کے ذریعے طاقت کا استعمال کرنے کے رجحان کی جزوی توضیح کے لیے ایک مستند اسلامی روایت موجود ہے۔ بلاشبہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام یا اکثر مسلمان طاقت استعمال کرنے کا رجحان رکھتے ہیں اور وہ ہر حال میں یا کسی خاص صورت حال میں ایسا طرز عمل اختیار کریں گے۔ تاہم اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی معاصر سرگرمیاں خالصتاً مقامی حالات کے اس تناظر میں نہیں سمجھی جاسکتیں کہ مسلمان محض اپنے علاقوں میں غیر ملکی قوتوں کی موجودگی پر اپنا ردعمل ظاہر کر رہے ہیں۔ ان کے ردعمل کی بنیاد بظاہر مخصوص صورت حالات کا ہی تقاضا ہوگی، لیکن اس ردعمل کو ایک حد تک اسلامی نصوص کی روشنی میں بھی دیکھا جانا چاہیے۔

اگرچہ زیر نظر مضمون کا محرک ۱۱ ستمبر کے واقعات ہیں، مگر یہ اس کاوش کا نتیجہ ہے کہ اسلام پسندوں کو سنجیدگی سے لیا جائے اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں خود ان کے دعوؤں کو اہمیت دی جائے۔ (میں ''اسلام پسند'' (Islamists) کی اصطلاح ان تحریکوں کے لیے مخصوص کر رہا ہوں جو سیاسی عزائم رکھتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، جبکہ ''بنیاد پرست'' (Fundamentalist) کی اصطلاح غیر سیاسی تحریکوں کے لیے استعمال کروں گا اور جو تحریکیں خالصتاً مذہبی بنیادوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے دین کا احیا چاہتی ہیں انہیں ''انقلاب پسند'' (Revivalist) کہوں گا) اس ضمن میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سید قطبؒ کے افکار بہت اہم ہیں، اگرچہ میں انہیں کسی منظم انداز میں مفصلاً بیان نہیں کروں گا۔ میں یہ فرض نہیں کروں گا کہ اسلام کے حوالے سے ان کی تعبیریں درست ہیں اور نہ یہ خیال ہی کروں گا کہ انہوں نے اپنے منفی مقاصد کے لیے اسلام کو ''ہائی جیک'' کیا ہے۔ یہ دونوں صاحب علم وفہم تھے۔ دونوں نے اپنے سے پہلے اور بعد کے اہل علم کی طرح، اسلام کی تجدید کی سعی کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے دین کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اسلامی نظام فکر کے اصلی خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی۔ دونوں نے اسلام کے ضمن میں قدامت پسندی اور جدت پسندی کے حوالے سے بعض معموں کو جنم دیا۔ میرے خیال سے ان کی تحریروں میں موجود اسلامی روایات کی فکری تجسیم کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے، کیونکہ ان کی تحریریں معاصر اسلام پسندی کی سب سے مؤثر ترجمان اور وکیل ہیں۔

عقیدۂ احتسابِ آخر اور عقیدۂ نجات

اسلام میں احتسابِ آخر کا عقیدہ اور عیسائیت میں نجات کا عقیدہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ عیسائی گناہ اوّل پر یقین رکھتے ہیں۔ کوئی عیسائی فرد محض اپنے بل بوتے پر نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا نے لوگوں کی نجات کو ممکن بنانے کے لیے اپنے بیٹے کو قربان کیا۔ لوگ نجات پائیں گے یا نہیں، اس کا فیصلہ صرف رحمت خداوندی کرتی ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کے مطابق خدا نے نجات کے حوالے سے ہر فرد کی تقدیر طے کر رکھی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ خدا نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ کر رکھا ہے اور جان بھی لے تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ اہم بات خدا کی وضع کردہ تقدیر نہیں، بلکہ یہ غیر یقینیت ہے کہ کوئی بھی اپنی نجات کے مثبت یا منفی مستقبل کو نہیں جانتا اور اپنے ارادے یا سعی کے حوالے سے اس ضمن میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اسلامی عقائد کے مطابق خدا کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء بالخصوص آخری پیغمبر محمدؐ، نے ماننے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والوں کو بتا دیا ہے کہ نجات کے لیے انہیں کیا کرنا ہے۔ خدا نے لوگوں سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کیا جو ان کی سکت سے بڑھ کر ہو۔ اگر لوگ خدا کے احکامات (جیسا قرآن اور سنت میں بیان ہوئے ہیں) پر عمل کریں گے تو قیامت کے روز خدا ان کے ساتھ نیک اور بد اعمال کی بنیاد پر انصاف کا معاملہ کرے گا۔

قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آیات کے ایک مجموعے کی صورت میں نازل ہوا۔ قرآن کا غیر مبہم پیغام اکثر مسلمانوں کے لیے بالکل واضح ہے۔ یہ پیغام آسان تفہیم کی غرض سے عوام کی زبان میں نازل کیا گیا۔

اصول اور احکام

رحمت خداوندی کی مذہبی رسائی (Soteriology) اور کسب عمل کی مذہبی رسائی (Escatology) میں تفاوت کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ عیسائیت میں اصول واقدار اہم ہیں، جبکہ اسلام کا زور قوانین پر ہے۔ عیسائیت اقدار کا ایسا ضابطہ متعارف کراتی ہے جو اعمال کو منضبط کرتا ہے، مگر اکثر ان اقدار کی قانونی جزئیات بیان نہیں کرتی۔ اس کے برعکس، اسلام کا زیادہ اصرار ایسے عملی احکامات پر ہے جو اکثر مسلمانوں کے نزدیک عام آدمی کی تشریحات سے بالاتر ہیں، جبکہ کچھ کے خیال میں ان احکام کی تشریح وتوضیح کا عمل ایک ہزار سال پہلے رک گیا۔ تقریباً تمام ہی مسلمان سمجھتے ہیں کہ تعبیر وتشریح کا عمل دورِ وحی میں مکمل ہوگیا۔ اگرچہ قرآن اور احادیث میں اصول بھی ملتے ہیں، تاہم اکثر وبیشتر عام اصول قانونی ضابطوں کی شکل میں بیان ہوتے ہیں مثلاً سماجی انصاف کا اصول صدقہ وزکوٰۃ کے قواعد کی صورت میں۔ روایتی طور پر ان احکامات کی تعلیم اصولوں کی صورت میں نہیں ہوتی ہے۔

شریعت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خدا کا قانون ہے۔ جیسا کہ ڈینی نے لکھا ہے، یہ شریعت ''مسلمانوں کی انصاف اور سماجی نظم سے وابستگی کو ایسے مربوط اور منظم معاشرے کا روپ دیے ہوئے ہے جس میں ''چرچ'' اور ''ریاست'' یا ''دین'' اور ''دنیا'' کی کوئی تفریق نہیں۔ شریعت کا یہ اور دوسرے پہلو ابھی تک معاصر مسلمانوں کے افکار اور سماجی روابط کو منظم اور فعال بناتے دکھائی دیتے ہیں''۔ اگرچہ ''شریعت''، ''قانون'' سے زیادہ وسیع لفظ ہے، تاہم یہ قانونی اصطلاحوں ہی میں مدون کی گئی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''قانون'' اصول اور قواعد، دونوں پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم جیسا کہ فضل الرحمٰن نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ''شریعت'' قواعد پر زور دیتی ہے اور یہ ایک ایسے تعبیری سانچے (Interpretive Framework) کے اندر منظم کی گئی ہے جو قواعد کے اطلاق سے نئی تبدیلیوں کی گنجائش رکھتا ہے۔

مسلمان مذہبی سطح پر خود کو اس بات پر مجبور پاتے ہیں کہ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر کریں جس میں شریعت کا نفاذ ہو سکے، نیکی کے امور احسن طریقے سے انجام دیے جاسکیں اور جس میں ایک مکمل اسلامی زندگی گزاری جا سکے۔ اگر ایسی دنیا کی تخلیق کے لیے ضروری ہو تو مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک جہاد مذہبی فریضہ بن جاتا ہے۔

مذہبی آزادی

جب ایک غیر مسلم سید مودودیؒ کی اسلامی ریاست، جہاں شریعت کی فرماں روائی ہو گی، کے بارے میں تعارف اور یہ نکتہ آرائی پڑھتا ہے کہ ایسی ریاست کس طرح غیر مسلموں کے لیے مفید اور حریت افزاء ہوگی تو یا وہ سید مودودیؒ کی دوسرے درجے کی شہریت کو مفید ثابت کرنے کی مہارت سے متاثر ہو جاتا ہے یا پھر ان کی بے باکی پر ششدر رہ جاتا ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ مودودیؒ اپنی تحریروں میں مخلص ہیں اور وہی لکھتے ہیں جسے وہ درست سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

اس معمے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مودودیؒ کے ذہن اور سماجی پس منظر کی طرف متوجہ ہوں۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ان کے دلائل کیونکر اثر انگیز ہیں اور دوسرے افراد اور خود ان کے اپنے لیے ایسے شفاف اور غیر مبہم کیوں ہیں۔ مودودیؒ سمیت بعض مسلمانوں کے نزدیک اگرچہ عیسائیوں کے لیے بھی مذہبی عقائد پر یقین راسخ کرنا ضروری ہے، تاہم مسلمانوں کے لیے ماننے کے ساتھ ساتھ عمل کرنا، شریعت کو نافذ کرنا اور اس کے مطابق زندگی گزارنا بھی عقیدے کا ایک پہلو ہے۔ شریعت ان کے مطابق سب کو وہ اختیار کرنے کی آزادی دیتی ہے جو وہ اختیار کرنا چاہتے ہوں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، یہ انہیں وہ اختیار کرنے کے لیے آزاد کر دیتی ہے جو حق ہے یعنی اسلام۔ اس طرح بہت سے مسلمانوں کے نزدیک مذہبی آزادی کے لیے ایک اسلامی ریاست میں شریعت کا نفاذ ضروری ہے اور ریاست و شریعت،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں ہی اسلام کی صحیح اطاعت کے لیے ضروری ہیں۔عیسائی نقطۂ نظر سے مذہبی آزادی کے لیے صرف یہ ضروری ہے کہ دین میں جبر نہ ہونے کے قرآنی حکم پر عمل کیا جائے۔

سید مودودیؒ کے طرزِ استدلال کو سمجھنے کے لیے، جیسا کہ اسمتھ نے تحریر کیا ہے، ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ''قرآن ایک روحانی گائیڈ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قانونی صحیفہ بھی ہے۔ جب اس کی بے شمار ہدایات کے ساتھ قریب قریب اسی کے درجے کی احادیث بھی شامل کی جاتی ہیں---تو ہمیں حیرت نہیں ہوتی کہ اسلام سامی مذاہب میں سماجی اعتبار سے سب سے زیادہ واضح اور مشرح ہے۔ اہل مغرب جو مذہب کی تعریف ایک ذاتی تجربے کے طور پر کرتے ہیں، ان مسلمانوں کے لیے کبھی بھی قابل فہم نہیں ہو سکتے جن کا دین انہیں ایک مخصوص سماجی نظم کے قیام کے لیے کہتا ہے۔ اسلام عقیدے کو سیاست سے اور دین کو سماج کے ساتھ ناقابل تحلیل انداز میں جوڑتا ہے''۔ جیسا کہ سید قطبؒ نے بیان کیا ہے، لفظ ''دین'' عقیدے سے کچھ زیادہ ہے۔''دین'' سے دراصل مراد ایک طرزِ زندگی ہے اور اسلام میں اس طرزِ زندگی کی بنیاد عقیدہ ہے۔ لیکن ایک اسلامی نظام میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ اس میں ہر طرح کے لوگ اپنے عقائد کی پیروی کر سکیں، جبکہ وہ ملکی قوانین جو بذاتِ خود آسمانی سند پر مبنی ہوں، کی اطاعت کر رہے ہوں۔

سید قطب نے لکھا تھا: ''اسلام لوگوں پر اپنے عقائد زبردستی نہیں تھوپتا، لیکن اسلام محض ایک ''عقیدہ'' بھی نہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اسلام دراصل مرد و زن کی دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزادی کا اعلان ہے۔ یہ ایسے ہر نظام کے خاتمے کے درپے ہے جس میں کچھ لوگ دوسروں پر حکم چلا رہے ہوں یا دوسروں کی غلامی کا طوق انسانوں کے گلے میں پڑا ہو۔ اسلام لوگوں کو ایسے تمام خارجی دباؤ اور رکاوٹوں سے آزاد کرانے کے بعد انہیں اپنے روحانی پیغام کی طرف مدعو کرتا ہے، ان کی عقل کو غور و فکر کی ترغیب دیتا ہے اور انہیں اس دعوت کے رد یا قبول کی مکمل آزادی بھی دیتا ہے۔ تاہم اس آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ دوسروں پر فرعون بن کر مسلط ہو جائیں یا دوسروں کی غلامی پر رضامند ہو جائیں۔ دنیا میں جس قسم کا بھی نظام استوار ہو، اسے لازماً اللہ کی حاکمیت پر مبنی ہونا چاہیے یعنی اس کے قوانین کا ماخذ صرف خدائی منبع ہو۔ اس کے بعد ایسے عالمی نظام کی زیرِ حفاظت، ہر فرد کوئی بھی من پسند عقیدہ اختیار کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے آزاد ہے''۔

یہی بات اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت مسلمانوں کے لیے عقیدے کی آزادی یا ''مذہبی آزادی'' ممنوع قرار دیتی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ باہر کے لوگوں کو اسلام کی طرف لائیں، لیکن اس بات کی اجازت نہیں کہ باہر کے لوگ مسلمان کا عقیدہ تبدیل کریں۔ ماسوائے اہل کتاب (عیسائی، یہودی اور امکاناً زرتشتی) کے جو اسلامی ریاست کی حدود میں اسلامی قوانین کے وفادار رہتے ہوئے اپنے عقائد پر قائم رہ سکتے ہیں، اگر کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرے گا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ یہاں ایک بار پھر غیر مسلموں کو بے انصافی اور بے قاعدگی محسوس ہوسکتی ہے، لیکن مسلم نکتہ نظر سے یہ مکمل طور پر برحکمت ہے۔

اس ضمن میں اہم نکتہ یہ نہیں کہ آیا مسلمان ''مذہبی آزادی'' کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں، بلکہ ہمیں یہ سمجھنا ہے، جیسا کہ ڈینی رقم طراز ہے کہ ''مسلمانوں کا یقین ہے کہ وہ خدا کی طرف سے زمین پر ایک صالح سیاسی اور سماجی نظام قائم کرنے پر مامور ہیں''۔ اور یہ سیاسی نظام ہر مسلمان کی نجات کے امکان کو بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح بہت سے مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ ایسا نظام نافذ کرنا ان کا فرض ہے۔

گولڈزیہر (Goldziher) نے اس نظریے کو اچھا پیش کیا ہے: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب خطے کے اندر اپنی کامیابیوں کو آنے والی نسل کے لیے یہ وصیت بنا کر چھوڑا: کافروں سے جنگ کرو، عقیدے کے زیادہ پھیلاؤ کے لیے نہیں بلکہ اس زمین کے پھیلاؤ کے لیے جس پر اس عقیدے کی حکومت ہے، دوسرے لفظوں میں جس پر اللہ کی حکومت تھی۔ اسلام کے جنگجوؤں کی فوری دلچسپی بھی کافروں کا مذہب تبدیل کرنے کی بجائے انہیں مغلوب کرنے میں رہی''۔ اس نکتے کو فضل الرحمٰن نے اسی طرح پیش کیا ہے: ''جہاں مسلمانوں نے اپنا عقیدہ تلوار کے زور پر نہیں پھیلایا، وہاں یہ بھی درست ہے کہ اسلام نے سیاسی طاقت کے حصول پر اصرار کیا ہے کیونکہ سیاسی اقتدار ہی کے ذریعے زمین پر خدا کا ارادہ (Will of God) نافذ ہوسکتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کمیونسٹ نظام سے مشابہ ہے جو لوگوں کو اپنے نظریات قبول کرنے پر مجبور نہ بھی کرتا ہو، لیکن سیاسی اقتدار کے حصول پر اصرار ضرور کرتا ہے۔ اس حقیقت کا انکار تاریخ سے انحراف اور خود اسلام کے ساتھ بے انصافی ہوگی''۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بظاہر غلط لیکن درحقیقت درست یہ ہے کہ مسیحی انفعالیت (Passivity) مفعولانہ حرکت پسندی (Instrumental activism) کو جنم دے سکتی ہے، جبکہ اسلام میں عمل کا تقاضا غیر معمولی شجاعت کو ابھار سکتا ہے۔ جیسا کہ گولڈز ہر نے کہا ہے: ''اسلام میں کسی طرح کی خانقاہیت (Monasticism) نہیں۔ مسلمانوں کی خانقاہیت مقدس جنگ (The Holy War) ہے''۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کو عام طور پر اسلامی عقائد کے جبراً نفاذ کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا (کم از کم اہل کتاب پر نہیں)، تاہم اس سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہوتی کہ شریعت کے نفاذ کے لیے جہاد مسلمانوں کی اکثریت کے لیے ایک مذہبی فریضہ اور اس طرح نجات کا ایک ذریعہ ہے یعنی یا تو نیکی کے کاموں سے اخروی نجات حاصل کی جائے یا پھر شہید ہو کر جنت میں فوری داخلہ حاصل کیا جائے۔

اسلام پسند (The Islamists)

آخر میں ہم اسلام پسندوں کی طرف آتے ہیں۔ اگر میری دلیل یہاں تک درست ہے، تو ہمیں ان کے طرز عمل کو ان روایات کے ذریعے سمجھنا چاہیے جنہیں انہوں نے پھر سے زندہ کیا ہے۔

گب (Gibb) کا استدلال ہے کہ ہمیں اسلام میں تصوف (Sufism) جس میں خدا اشیاء کے داخل میں موجود ہے، اور شریعت (Orthodory) جس میں خدا اشیاء سے بالاتر وجود ہے، کے مابین ایک کشمکش ملتی ہے۔ تصوف میں روحانی بزرگ خدا اور عوام کے درمیان رابطہ پیدا کر سکتے ہیں اور خدا ان عوام کے باطن میں بھی صوفیانہ تجربے کے ذریعے ظاہر ہو سکتا ہے۔ داخلیت یا باطنیت (Immanenence) کے اس نظریے کے خلاف ہر دور میں اہل روایت کی طرف سے ردعمل سامنے آیا ہے جن کے نزدیک یہ نظریہ اسلامی توحید سے انحراف ہے، کیونکہ خدا اشیاء سے بالاتر صرف پیغمبروں کے ذریعے جانا جا سکتا ہے اور صرف قرآن اس کی شخصیت کا ترجمان ہے۔

اس کشمکش کو تاریخ میں تسلیم کیا گیا ہے اور بعض دفعہ اس کے تدارک کے لیے ''اصلاح'' (Reformation) کی تحریکیں چلائی گئیں، یعنی اسلام کے اصل ماخذوں، قرآن اور سنت کی طرف مراجعت۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں خوارج کے دور سے لے کر، تیرہویں اور چودھویں صدی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن تیمیہؒ کی منگولوں کے خلاف محاذ آرائی، اٹھارہویں صدی کی وہابی تحریک اور عصر حاضر تک، ان احیاء پسندوں کے نزدیک اسلام میں پیدا ہونے والی ہر خرابی کی جڑ، عقیدہ وعمل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب محمدؐ کے خالص اسلام سے انحراف ہے۔ اس طرح تقاضا اس بات کا پیدا ہوا کہ مستند روایت کو پھر سے بحال کیا جائے، نیکی کو فروغ دیا جائے، خدائی ارادے کے نفاذ کے ذریعے شر سے لڑا جائے، انسان پر سے انسان کی حاکمیت ختم کی جائے جو کہ شرک کی ایک صورت ہے۔

جیسا کہ گب نے لکھا ہے ''مشرق اور جنوب، ایشیا اور افریقہ کے علاقوں میں اسلام کی اشاعت زیادہ تر صوفی سلسلوں کے ذریعے ہوئی اور یہ سلسلے بہت سی صورتوں میں ایسی روایات اور عامیانہ خیالات کی تائید کرتے تھے جو اسلامی توحید کے سخت اصول وقواعد سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجموعی اعتبار سے مسلم معاشرے میں ثقافتی توازن اعلیٰ روایتی نظریے [توحید] کے خلاف ہوتا چلا گیا۔ ---علم کلام (Theology) نے صوفی نظریے سے مفاہمت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، اسلام کا نظریاتی قلعہ اندر سے کمزور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جلد یا بدیر اس کا ردعمل ہونا تھا، اس لیے کہ قرآن کا معاشرے میں ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے رہنا ضروری تھا۔ اور عوامی گمراہی کے نتیجے میں جب یہ ردعمل پیدا ہوا تو یہ بہت شدید اور غیر مفاہمانہ تھا''۔

یہ ردعمل، گب کی جاری بحث کے مطابق، وہابیت تھا، لیکن اسلام پسندوں کا ردعمل بہت سی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ موجودہ دور میں، اسے صرف مغربی استعماریت اور عالمیت (Globalization) کے خلاف ردعمل کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور مختلف احوال میں اس ردعمل نے مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے ساتھ، ہمیں یہ بھی سمجھنا ہے کہ نہ تو یہ ردعمل نیا ہے اور نہ اسلامی امپریلیزم کا مطالعہ ہی۔ اسلام تاریخ میں مسلسل طور پر ایک توسیع پسندانہ محرک رہا ہے اور اسلام پسندوں کے نزدیک جہاد شریعت کے نفاذ کے لیے ایک جارحانہ جنگ ہے اور اس سوچ کا سلسلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی تاریخ۔ سید قطبؒ، مودودیؒ کی موافقت میں، اس نکتے کو بہت واضح پیش کرتے ہیں ''جب مصنفین شکست خوردہ اور معذرت خواہانہ ذہنیت کے ساتھ ''اسلام میں جہاد'' کے موضوع پر لکھتے ہیں اور اسلام پر سے اس ''دھبے'' کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ دو باتوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں اول یہ کہ یہ دین طاقت کے ذریعے عقیدہ مسلط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کے خلاف ہے، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے ''دین میں کوئی جبر نہیں''۔ دوم، یہ کہ یہ دین ان تمام سیاسی اور مادی طاقتوں کا خاتمہ چاہتا ہے جو عام لوگوں اور اسلام کے درمیان کھڑی ہوتی ہیں اور انہیں اللہ کی حاکمیت قبول کرنے سے روکتی ہیں''۔ سید قطب کے نزدیک، جاہلیت ہر طرف موجود تھی، دارالاسلام کا وجود نہ تھا اور جہاد ان ممالک میں فرض ہو گیا جہاں اسلام کا غلبہ تھا ان ممالک کے خلاف جہاں کافروں کا غلبہ تھا۔

تاہم ان میں سے کسی بات سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ اکثر مسلمان مغرب کے خلاف ایک مقدس جنگ چاہتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ حالات ایسی جنگ کے لیے موزوں نہیں ہیں اور اسلام نے کبھی کسی ناممکن الوقوع امر کا تقاضا نہیں کیا۔ بات صرف یہ ہے کہ غلبۂ جاہلیت کے اس دور میں جہاد کی پکار بہت سے مسلمانوں کو متاثر کرتی ہے۔

معاصر اسلام پسند جن معاشروں میں کام کر رہے ہیں وہاں بہت سے افراد ان کے نظریات اور عزائم سے بے تعلق ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اسلام پسندوں کے ساتھ ''جہاد'' میں عملی شرکت تو نہیں کرتے، لیکن ان کے نظریات کی مخالفت بھی نہیں کرتے۔

اسلام پسندوں کے یقین کے مطابق وہ جانتے ہیں کہ خدائی نصرت کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں جہاد ایک فراموش کردہ مذہبی فریضہ ہے جس کے ذریعے شریعت کو پہلے اپنے معاشرے میں اور پھر دوسری قوموں پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ذمہ داری اسلام پسندوں نے ایک مستند اسلامی روایت سے اخذ کی ہے۔ انہوں نے اسلام کو ہائی جیک نہیں کیا، بلکہ وہ ایسے نظریات کے تحت کام کر رہے ہیں جن کی تاریخ اسلام کے دورِ اوّل سے جا کر ملتی ہے۔ ان کی تحریک کا ماخذ ان کے دینی عقیدے کے مقدمات ہیں کہ خدا نے ان کے لیے ایک سیدھی راہ متعین کر دی ہے اور اگر وہ اس راہ پر چلیں گے تو قیامت کے روز وہ جنت کی ابدی زندگی کے مستحق بن جائیں گے۔ جہاد کے شہداء کے لیے فوری جنت کا وعدہ ان کی تحریک کو مہمیز کرتا ہے کہ وہ اپنے سمجھے ہوئے خدائی ارادے کی تکمیل کریں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ آیا خدا نے ان کے لیے جہاد میں موت مقدر کی ہے یا فتح، لیکن وہ جانتے ہیں کہ پہلی صورت میں ان کے لیے فوری انعام ہے، جبکہ دوسری صورت میں وہ آخرت کے دن اپنے سرخرو ہونے کے امکانات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑھالیں گے۔

اداروں کی تعمیراور فروغ

ممکن ہے کہ بہت سے مسلمان میری پیش کردہ تصویر کے دائرے سے باہر ہوں۔ تاہم متعدد مسلمان اسی تصویر کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس تصویر میں اسلام کا وہ ستون موجود ہے جو مسلمانوں کو یکسو کرتا ہے اور جہاں مسلمان خدا سے، ایسا خدا جو انسانی تصور اور تجربے سے ماوراء ہے، اصول وقواعد کا مجموعہ حاصل کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے پوری کائنات پر اللہ کی حکمرانی (نفاذ شریعت سمیت) قائم ہو سکے۔

اگر دنیا میں مسلمان دس کروڑ سے زائد ہوں اور میری پیش کردہ تصویر محض ان کے ایک قلیل اوسط کا احاطہ کر پائی ہے، اور وہ مسلمان جن کی تصویر میں نے صحیح طور پر پیش کی ہے اس کا تناسب ایک بڑے سمندر میں مچھلی کے برابر ہے، تو یہ تعداد باقی تمام دنیا کے لیے، مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر، ایک قابل لحاظ خطرے کا باعث ہے۔

اب فرض کیجیے میری پیش کردہ تصویر درست ہے، کم ازکم کچھ مسلم ممالک کی حد تک سہی! یا اس تصویر کو نامکمل ہی خیال کیجیے، تب بھی شاید یہ جہاد کی کسی نہ کسی صورت کو اپنانے میں محرک ثابت ہوتی ہے، شاید اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ کس طرح جہادی کاوشوں کو سند جواز مل سکتا ہے اور یہ جڑ پکڑ سکتی ہیں۔ تاہم اس بات کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ جہادی صلاحیت کے حامل افراد کے پاس مطلوبہ وسائل ہیں یا نہیں؟ اور اگر ہیں تو وہ کس قسم کی کارروائیاں کرسکتے ہیں؟ نہ ہی اس بات کا اندازہ لگانا ممکن ہے کہ ان کی مخالف قوتیں یا اہداف کون لوگ یا ریاستیں ہیں؟

یہ وہ صورت حال ہے جہاں اسلام میں اداروں کی تعمیر اور فروغ کا موضوع گہری مطابقت رکھتا ہے، اسلام میں اگر مبلغ حضرات ہوں بھی تو کوئی ''چرچ'' نہیں ہے۔ ایک مثالی مسلم معاشرے میں جہاں ''چرچ'' (مراد ممکنہ اسلامی ادارے) اور ریاست کے مابین اتفاق پایا جاتا ہو، جہاں مذہبی اور غیر مذہبی عناصر میں کوئی نمایاں امتیاز موجود نہ ہو، وہاں ریاستی اقدام کے ذریعے علماء کے درمیان اتفاق رائے پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے برے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلام کا سیاسی انحطاط، بیرونی حکمرانوں کے زیر قیادت ''محمدیوں'' کی تعداد میں اضافہ، جو بظاہر مذہبی امور کے ماہرین کے طور پر لیے جاتے ہیں، دوہرے انداز میں خطرناک ہیں، کیونکہ انہیں اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ ایک آزاد زندگی کے تصور کے مقابلے میں اسلام کی روحانی تعلیمات بے وزن رہ جائیں گی، اس کمزور موٗقف سے صرفِ نظر کے لیے وہ مذہب کو لائسنس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس سے بھی خراب صورت حال یہ ہے کہ علماء کا تعلق غیر پسندیدہ ریاستوں سے استوار ہو جاتا ہے۔ بدعنوان حکمران ٹولے کی موجودگی میں ان کی اپنی بدعنوانی ظاہر ہونے لگتی ہے جس کے باعث ان کے پیروکاروں کا ایمان اُن پر سے اٹھ جاتا ہے۔ متعدد اسلام پسندوں (Islamists) کو بداعتمادی کی ایسی ہی فضا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال بہرحال ایک خطرناک رجحان رکھتی ہے۔ کیونکہ ''اسلام پسند'' مسلم معاشروں میں بآسانی اپنا اثر رسوخ قائم کر لیتے ہیں اور براہ راست یا بلواسطہ طور پر یہ مسلم ریاستوں میں انتہا پسندی کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔ دراصل کسی مستند مذہبی ادارے کی غیر موجودگی میں، کسی شخص کو قانون کی خلاف ورزی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ علما جو ریاست سے وابستہ ہیں، ایسی سرگرمیوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں لیکن بہرحال ان کی یہ صلاحیت اسی نوعیت سے مشابہ ہے جو لاقانونیت کے خوف سے پیدا ہونے والی کسی ریاست کی جوابی کارروائی کی ہو سکتی ہے۔

ایک ایسے عالمی نظام میں جہاں ''لبرل'' سماجی اقدار وسیع پیمانے پر پھیل چکی ہوں، مرکزی دھارے کی تنظیموں اور اس نظام پر انحصار کرنے والی ریاستوں کے لیے بنیادی اقدار کا جم کر مقابلہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اسلام پسندوں کے نیٹ ورک، جو اپنی اقدار پوری مزاحمانہ قوت سے متعین کرتے ہیں، اس نظام کے تحت کنٹرول نہیں کیے جا سکتے۔

قلیل مدت کے لیے شاید ہماری توقعات یہ ہیں کہ ایک وسیع تر اسلامی ثقافت میں ہم اسلام پسندوں کی حمایت کو محدود کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر متعدد افراد اور تنظیمیں (مثلاً سعودی افراد) جو اسلام پسندوں کو مالی امداد فراہم کرتی ہیں، انہیں اس عمل سے روکا جائے۔ ہمیں ایسے واقعاتی اقدامات کرنے چاہییں جس کے نتیجے میں اسلام پسندوں کو لاقانونیت سے کلیتاً باز رکھا جا سکے یا کم از کم ایسی سرگرمیوں کے امکانات کو محدود کیا جا سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طویل مدت کے لیے یہ توقعات رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ مغرب میں بسنے والے مسلمان اپنے دین کے مستند قواعد وضوابط کو مزید شفاف اور دانشمندانہ اخلاقی اصولوں میں ڈھالنے کا کام کریں گے تا کہ دینی اصولوں کی عام فہم تعبیر ممکن ہو سکے۔ مغرب، یورپ اور شمالی امریکہ میں بسنے والے مسلمان اس بات کا امکان نہیں پاتے کہ وہ اسلامی ریاستوں کو تشکیل دیں جس کے ذریعے مسلمانوں کی اکثریت پر حکومت کر سکیں۔ غالباً ان حالات میں وہ چاہیں گے اسلام کو ایک ایسے مذہب کے طور پر متعارف کروائیں جو کسی بھی انسانی معاشرے میں رواداری کے اصول پر آگے بڑھ سکے، جیسا کہ امریکہ میں ہے۔ پھر ایک مذہب کے اندر مختلف نقطۂ ہائے نظر پائے جا سکتے ہیں جو متعلقہ لوگوں کی انفرادی زندگی کے لیے اہمیت رکھتے ہیں لیکن کسی بھی نقطۂ نظر کو سیاسی بنیاد پر مسلط کرنے کی کوشش مناسب نہیں۔ انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے آفاقی اصول اسلام کا حصہ ہیں۔ ان کی بنیاد پر مذکورہ اندازِ فکر کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ بین المذاہب مفاہمت کا یہ مطلوب اندازِ فکر ''امت'' کی سطح پر مثبت طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اندازِ فکر کے فروغ پانے تک یہ واضح رہنا چاہیے کہ اسلام پسندوں کی اپنی فہم، تحریک اور روایات کے نتیجے میں ان کی سرگرمیوں کو جواز حاصل ہوتا رہے گا۔

[مارک گولڈ ھاور فورڈ کالج میں سوشیالوجی کے پروفیسر ھیں]

© rasailojaraid.com